قرآن کا تصورِ امن

پروفیسر سید مسعود احمد

دور حاضر کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ بعض مخالفین اسلام قرآن حکیم کے انقلابی تصورِ امن تو کجا، اس کتاب میں امن وسلامتی کے پیغام تک کے انکاری ہیں اور بعض دانش ور دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کوئی نپا تلا (Well defined and systematic) تصور امن اور جامع نظامِ امن وسلامتی پیش نہیں کرتا۔ ان کے یہ الزامات تعصب و مرعوبیت اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم کے مخاطب اولین اُمّی اور فلسفہ وتہذیب سے نا آشنا تھے، یہ وہ لوگ تھے جو بدویت وفطرت سے قریب اور تصنّع و مدنیت سے کوسوں دور تھے۔ ایسی بدو قوم کے سامنے امن وامان کا علمی وفلسفیانہ تصور پیش کر کے ان کو قرآن مجید کی عام تعلیم سے قریب کیا جا سکتا تھا نہ ان کے لیے اس طرزِ دعوت میں قرآنی مشنِ امن وسلامتی کے لیے کوئی جذباتی اپیل ہوتی۔ البتہ نزولِ قرآن کے وقت دنیا کی بالعموم اور جزیرۃ العرب کی بالخصوص ناگفتہ بہ حالت بنیادی طور پر پائیدار قیام امن ہی کی متقاضی تھی اور ظلم وفساد کی چکی میں پسی سسکتی و کراہتی انسانیت کو سب سے پہلے امن وسکون کے مرہم کی ضرورت تھی، لہٰذا اس حقیقت سے تو انکار کی گنجائش نہیں کہ قرآنی تحریک و دعوت روز اول ہی سے پائیدار امن وسلامتی کی علم بردار تحریک تھی، البتہ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ قرآن حکیم نے عصری طرز کا کتابی فلسفۂ امن پیش نہیں کیا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ خود قرآنی تحریک وتعلیم کا اپنا طرز دعوت اور منفرد اسلوب ہے۔ قرآن کا وہ اسلوب تحریری ہونے کے بجائے تقریری ہے اور اس میں سماجی پس منظر اور مخاطب کے مزاج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے پیش کردہ اصولِ امن

کسی سورہ میں یکجا پیش نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ متعدد سورتوں میں بقدرِ ضرورت مختلف اصول بار بار مگر نئے انداز میں پیش کیے گئے ہیں اور بعید ترین گوشوں تک سے موضوعاتی تعلق قایم کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، تاکہ زمان و مکان کی قید سے ماوراء سارے ہی مخاطبینِ قرآن اُن جلیل القدر اصول و اقدار کو آسانی سے اخذ کر سکیں۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کے مخاطبینِ اول کے مزاج کے مطابق طرزِ تخاطب سے اس کی آفاقیت مجروح ہوتی ہے، لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ آج بھی کسی آفاقی تعلیم کو اِسی زمان و مکان کے تحت ہی پیش کیا جائے گا۔ اس کی بہترین شکل یہی ہے کہ مخاطبینِ اولین ہی میں سے ایک ایسے معتد بہ گروہ کو تیار کیا جائے جو اس تعلیم کی حقانیت پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہو اور اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ ہر آفاقی تحریک کو اپنے آغاز کار میں مخاطب کی زبان، اس کے مزاج، اس کی عقلی سطح اور اس کی تعداد وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے اپنا آفاقی پیغام پیش کرنا پڑتا ہے، رفتہ رفتہ وہ تحریک اپنے انقلابی و آفاقی پیغام کے سانچے میں خاموشی کے ساتھ انسان سازی شروع کر دیتی ہے اور مذکورہ بالا عوامل اخذ و ابلاغ میں اس کے سدِّ راہ نہیں بنتے، یہاں تک کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کے اپنے کار پردازوں کی تعداد و شخصیت (Numerical strength and quality) بذاتِ خود ہر قسم کے مخاطبین کو متاثر کرنے کی پوزیشن میں ہو جاتی ہے۔

امن کی اہمیت قرآن وسنت میں

اعتراض کرنے والوں کو اس بات کا تو اختیار ہے کہ وہ قرآن کے پیش کردہ تصورِ امن کو نہ مانیں۔ انھیں اس کا بھی اختیار ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی اسلوبِ دعوت پر تنقید کریں، مگر یہ چیز ان کے تعصب اور جہالت کی دلیل ہوگی کہ وہ انفرادی و اجتماعی امن و سکون سے متعلق آیات سے چشم پوشی کرتے ہوئے قرآن کے پیغامِ امن وسلامتی ہی کا انکار کر دیں۔ مثال کے طور پر بقول صاحبِ تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ "مشرکین کے پنجۂ ظلم سے بیت اللہ کی بازیابی بعثتِ محمدیؐ کا اولین نصب العین تھا"۔[۱] اسی بیت اللہ

کے تعلق سے مخاطبِ اول یعنی قریش سے اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کو نو بار[۲] قرآن میں مختلف جگہوں پر دُہرا کر 'امن' کی اہمیت پر اس طرح مہر تصدیق ثبت کرتا ہے کہ بیت اللہ ان کے لیے باعث امن ہے، ایک بار تو نہایت وضاحت سے کہا گیا:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَماً آمِناً وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ (العنکبوت:۶۷)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک پُر امن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟

اسی طرح امن کی مخالف و متضاد اصطلاح یعنی 'فساد' کی قباحت و شناعت پر قرآن عظیم کی کم و بیش پچاس آیات ملتی ہیں۔[۳] چنانچہ واضح ترین الفاظ میں فرمایا گیا کہ 'اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْفَسَادَ' البقرۃ:۲۰۵ (درحقیقت اللہ تعالیٰ فساد کو بالکل پسند نہیں کرتا) اور 'وَاللّٰهُ لاَ يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ' المائدۃ:۶۴ (اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا) بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ حالتِ عدمِ فساد کو پسند کرتا ہے۔ اور اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ اس کے قیام و تشکیل میں پورا زور صرف کر دیں۔ امن و امان کے قیام کے سلسلہ میں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنگ و قتال جس قوم کی گویا گھٹی میں پڑے ہوں اور جہاں جنگ سے دست بردار ہونا بزدلی کی علامت سمجھا جاتا ہو ان حالات میں نہ صرف صلح کی پیش کش کرنا، بلکہ بہ ظاہر دَب کر صلح کر لینا اسلامی تاریخ کا ایک زرّیں باب بن چکا ہے۔ اس سے ہماری مراد صلح حدیبیہ ہے جس کو قرآن حکیم فتح مبین قرار دیتا ہے۔ (الفتح:۱)

یہ واقعہ بھی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے کہ قرآن کا داعیِ اول اور حاملِ وحی الٰہی، جو دورانِ جنگ سپہ سالار ہو، صفوں میں سب سے آگے رہتا ہو اور مسلّح بھی ہو، مزید برآں کمین گاہ کے بجائے دشمن کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہو اور ایک دو نہیں تئیس جنگی کارروائیوں میں بہ نفسِ نفیس شریک رہا ہو پھر بھی ذاتی طور پر صرف ایک شخص کو جنگ میں قتل کرنے کا ریکارڈ رکھتا ہو، وہ بھی صرف اس بنا پر کہ دشمنِ رسول ﷺ میدانِ جنگ میں آپؐ کا نام لے کر مبارزت طلب کر رہا تھا اور یہ انتہائی بزدلی تھی، نیز شانِ سپہ سالاری

اور جنگ کے اصول کے خلاف تھا کہ جوابی کارروائی کے لیے اپنے کسی ساتھی کو بھیج دیا جاتا۔ مزید برآں یہ حیرت انگیز واقعہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسلام کے داعیِ اول کے سوا تاریخِ انسانی میں کوئی اور مثال نہیں ہے جس نے عین فتح اور سب سے بڑی فتح کے وقت مخالف فوج کے سپہ سالار کو جو اس وقت تک اس کا سب سے بڑا دشمن بھی تھا، معاف کیا ہو اور نہ صرف معاف کیا ہو بلکہ یہ اعلان بھی کرایا ہو کہ دشمن کے کیمپ کا کوئی بھی شخص اپنے سپہ سالار کے ہاں پناہ لے لے تو وہ بھی مامون ہو جائے گا اور یہ معافی کسی صلح نامہ کی شرط کا حصہ نہ ہو۔ اس تاریخی حقیقت پر بھی نظر رہے کہ تیئیس سالہ دورِ رسالت ؐ میں ابتدائی تیرہ سال تک تو قرآن کی رو سے قتل و حرب حرام رہا اور دس سالہ مدنی زندگی میں کم و بیش ترّاسی چھوٹی بڑی حربی کارروائیوں میں پورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو گیا اور بعض دفعہ میدانِ جنگ میں ایک لاکھ سے زائد فوج بھی سامنے آئی، اس کے باوجود کل مقتولینِ جنگ کی تعداد بشمول مخالفین ایک ہزار اٹھارہ اور کل مسلم مجروحین کی تعداد ایک سو ستائیس تھی۔[۲۹] اس کے برخلاف کون نہیں جانتا کہ انقلابِ روس اور انقلابِ فرانس میں لاکھوں انسانی جانیں تلف ہوئیں جن میں سے اکثر و بیشتر بے گناہ شہری تھے اور بیسویں صدی میں قیامِ امن کے نام پر جو جنگیں برپا ہوئیں ان میں کروڑوں بے گناہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام نے امن و سلامتی کو اتنی اہمیت دی ہے تو وہ جنگ و قتال کی اجازت ہی کیوں دیتا ہے؟ اس کے لیے قرآن کے تصورِ جنگ کو بھی زیرِ بحث لانا ہوگا۔ اس موضوع پر تدبر کی نظر ڈالی جائے تو اس کی چار جہات معلوم ہوتی ہیں:

اول: قرآن مجید کے احکامِ جنگ و عدمِ جنگ زمان و مکان کے تناظر میں (Temporal and spatial perspectives of Jihad-e-Islami)۔

دوم: قرآن حکیم کے احکامِ جنگ و جہاد نبی آخر الزماں کے تناظر میں (Jihad's perspectives in the light of Munammad (PBUH) as last prophet)۔

سوم: قرآن حکیم کے احکامِ جنگ و امن ہمہ وقتی اور آفاقی تناظر میں (Quranic teachings as universal guidance to humanity)۔

چہارم: قرآن کا تصورِ امن بحیثیت ہمہ گیر اور مثالی نظریہ سکون حقیقی دنیا کے تناظر میں Quranic concept of universal peace and tranqility in the real world)۔

احکامِ جنگ زمان و مکان کے تناظر میں

اس سلسلے میں ایک طرف بعثتِ محمدیؐ کے وقت کی جزیرۃ العرب کی مخصوص سیاسی و سماجی نیز معاشی و مذہبی صورت حال کو سامنے رکھنا ہوگا، دوسری طرف مخالفینِ اسلام کے رویہ کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ایک طرف ظلم، سازش، قطع رحمی اور مخالفت کی انتہا کردی گئی تھی، یہاں تک کہ داعیٔ قرآن کو منظّم سازش کے ذریعے اور پیروان اسلام کو بذریعۂ جنگ ہلاک کر کے اسلام کو مٹانے کا تہیہ کیا جاچکا تھا۔ اس کے پیش نظر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت اپنی سلامتی اور نظریۂ اسلام کی بقا (Survival) کے لیے اور کیا متحدہ حکمتِ عملی اختیار کی جاسکتی تھی؟! ہوسکتا ہے کہ مذہب کا عصری تصور ذہن کو جنگ سے ہر حال میں گریز ہی کی طرف مائل کرے تو عرض ہے کہ پیغمبر اسلام نے بھی حتی الامکان یہی رویہ اختیار کیا اور ایک دو سال نہیں بلکہ اپنے تیئس سالہ دورِ نبوت کے ابتدائی تیرہ سالوں میں اپنے کسی پیرو کو دشمن پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی، حالانکہ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ وخوں ریزی سے بچنے کے لیے ہی پیروان اسلام نے تین تین بار ہجرت کی اور اپنا ملک عزیز چھوڑا، اس کے باوجود مخالفین اسلام نے اسلام کی قطعی پُرامن تحریک کو طاقت وقوت سے کچلنے کا بیڑا اٹھالیا تو کوئی بھی انصاف پسند محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ سراسر ظلم، نفرت تعذیب اور سازشوں کے جواب میں اور ہجرت کے بعد باقاعدہ پیش آمدہ جنگ میں مدافعت کے بجائے خود کو موت اور قائدِ تحریک کو دشمن کے حوالے کردینا چاہیے تھا، سوال یہ ہے کہ کیا اُس حکمتِ عملی سے دنیا کو پائدار امن کا پروانہ مل سکتا تھا یا صورتِ حال اور بگڑتی اور دنیا تا قیامت ظلم وفساد کی آماجگاہ بن جاتی، نیز

مظلومین کی آہیں صدا بصحراء ثابت ہوتیں اور ان کی داد رسی اور عدل و انصاف کے کوئی معنیٰ نہ رہتے۔ اس کے برخلاف دنیا نے چند سال بعد ہی بہ چشم سر دیکھا کہ قرآنی تحریک کے زیرِ سایہ نمو پذیر امتِ مسلمہ کے طفیل اور پیغمبرِ امن وسلامتی کی پیش گوئی کے عین مطابق عورت تن تنہا دور دراز کا سفر طے کرتی ہے اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا۔[۵]

واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد کے حالات میں جنگ کے ذریعہ دشمن کو دفع نہ کیا جاتا تو علاماتِ امن و انسانیت یعنی عبادت گاہیں تک دنیا سے نیست و نابود ہو جاتیں (الحج-۴۰) خون کی پیاسی اور منظّم طاقتوں کے سامنے کما حقہ، منظّم مدافعتی کارروائی نہ کی جاتی تو امن کے اصل علم بردار کیسے بچتے اور اس آفاقی تحریکِ امن وسلامتی کی آبیاری کیسے ہوتی۔

نبی کریم ﷺ کی مخصوص حیثیت

دوسرا اہم نکتہ نبی اکرم ﷺ کی، سلسلۂ نبوت میں اپنی مخصوص حیثیت ہے جس کے تحت آپ محض اللہ تعالیٰ کے رسول ہی نہیں، بلکہ آخری رسول ہیں۔ آپؐ کو بہ حیثیت ختم الرسل تکمیلِ دین اور اتمام شریعت کا عملی مظاہرہ مختلف شکلوں میں کرنا تھا (المائدہ-۳) اظہار علی الدین اس کی اہم ترین شِق ہے (التوبہ-۳۳، الصّف-۹، الفتح-۲۸)۔ اس کے لیے 'سیاسی قوت' اور اسلامی حکومت کا قیام ناگزیر ہے۔ چنانچہ اہل علم کی آراء کے مطابق دینِ اسلام عقلی طور پر اور دلیل کی سطح پر تو ہر زمانہ میں ظاہر و غالب رہا، البتہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے حقیقی قیام اور اسلامی قوانین کے کلی نفاذ کے لیے اقامتِ دین کی مکمل شکل آں حضرت ﷺ ہی کے دست مبارک پر قائم ہونی تھی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِؤُواْ نُورَ اللّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّهُ إِلاَّ أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○ هُوَ الَّذِيُ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور کو مکمل کیے بغیر نہ مانے گا چاہے اسے کافر ناپسند ہی کریں۔ اسی اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت

لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (التوبۃ:۳۲-۳۳)

اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے چاہے اسے مشرک کتنا ہی ناپسند کریں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں اظہار دین ہو کر رہے گا۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی کے نزدیک ان آیات میں لفظ 'رسول' سے مراد تمام انبیاء کرام فرداً فرداً ہیں،۶؎ یعنی ان کے نزدیک ہر رسول کی بعثت کا مقصد اظہار علی الدین ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ 'اظہار علی الدین کلہ' اپنے کامل عملی شکل میں ظہور پذیر ہو یا نہ ہو۔ ان کے نزدیک اللہ کا رسول اس کے قانون پر ہی عمل کرتا ہے اور کم از کم اپنے اور اپنے متبعین (Followers) کی سطح پر خدائی قانون کے زیر سایہ زندگی گزارتا ہے۔ جب کہ مولانا امین احسن اصلاحی اس سے آخری رسول حضرت 'محمد ﷺ' مراد لیتے ہیں اور ''واللہ متم نورہ'' سے ربط قائم کرتے ہوئے اظہار علی الدین کو دین کی تکمیل کی شرح قرار دیتے ہیں۔۷؎

آنحضرت ﷺ کے ختم رسالت پر مبنی اس مخصوص منصب کی اور بھی جہات ہیں۔ مثلاً آپؐ کے بعد تا قیامت کوئی رسول مبعوث نہ ہونے کی وجہ سے آپؐ کے پیروکاروں کے کندھوں پر دعوتِ اسلام کی ذمہ داری بھی آجاتی ہے اور اس عالم اسباب و علل میں 'خاتم نبوت' کے لیے حسّی معجزات کا ظہور بھی خلافِ حکمت قرار پاتا ہے۔ یعنی اگر فی الواقع ایسا ہوتا کہ دشمنانِ اسلام کو اللہ تعالیٰ معجزاتی طور پر سماوی عذاب سے ہلاک کرتا تو امت مسلمہ کے لیے دعوتِ دین کے ہر مرحلہ میں دستِ غیب کا تصور اس کی صلاحیتوں کے ابھرنے میں مانع ہوتا۔ یہ عذر قائم رہتا کہ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تبلیغِ اسلام کے طریقوں کے تعلق سے کوئی یکسانیت نہیں ہے، لہذا ہم انبیائی مشن کے مکلّف نہیں۔ چنانچہ حکمتِ خداوندی کے تحت اس عذر کی بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی اور پیروانِ رسولِ خاتم کے ہاتھوں دشمنانِ دین متین کی ہلاکت کا فیصلہ فرمایا (الانعام- ۶۵،

انفال-۴۲) اور مسلمانوں کو جنگ کی اجازت مرحمت فرمائی گئی (الحج-۳۹)۔

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تحریکِ امن اس محدود معنٰی میں امن وسلامتی کی تحریک نہیں تھی جو انفرادی طور پر روحانی ونفسیاتی سکون کے ہم معنٰی ہو، یا زیادہ سے زیادہ مجرد اجتماعی امن کا نعرہ لے کر اٹھی ہو، بلکہ قرآن کا موضوع بنی آدم اور انسان کُل ہے اور اس کے گونا گوں مسائل ہیں۔ قرآن حکیم نہ صرف ان تمام مسائل کا پائدار اور حقیقی حل تجویز کرتا ہے، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر انسان کی حقیقی فلاح وکامرانی کی طرف بھی رہ نمائی کرتا ہے۔ اس کے مطابق ان دونوں بیش بہا نشاناتِ منزل یعنی امن وسکون کا قیام اور فلاح وترقی کے حصول کے لیے اس دنیا میں عدل وقسط کا قیام ناگزیر ہے اور اس نظامِ عدل ومیزان کو لوہے یعنی عسکری قوت کے بغیر قائم نہیں کیا جاسکتا (الحدید-۲۵)۔ اخلاقی قوت وطاقت بے شک صالح انقلاب کا بہت بڑا عامل ومحرک ہوتی ہے اور اس کا بھرپور استعمال اسلام کی عین منشا بلکہ اس کا بنیادی حکم ہے، مگر یہ کُل نہیں ہے، کیوں کہ اس عالم خیر وشر میں شیطان کا وجود بھی مسلّم ہے اور یہ انسان نما شیاطین ظلم وفساد کو بزور جبر قائم رکھنا چاہتے ہیں اور شریفوں کے حسنِ اخلاق کو بزدلی گردانتے ہیں۔ چونکہ شیطان انسان کو سکون سے جینے تک کا حق نہیں دیتا، لہٰذا دفع فتنہ اور ازالۂ منکرات نیز مظلومین کی مدد کے لیے، بالفاظ دیگر فتنہ و فساد پر بندھ باندھنے کے لیے داخلی طور پر ایمان دار پولیس اور محکمۂ انصاف اور خارجی سطح پر مضبوط وبارعب نیز شہادت کی متمنی فوج کی موجودگی ہی پائدار اور حقیقی امن وسکون کے قیام کی ضمانت دیتے ہیں۔

قرآنی تصورِ امن کی مختلف جہات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اصل موضوع پر بحث کی جائے کہ قرآن کا تصور امن کیا ہے؟ اس کی مختلف جہات کیا ہیں؟ اور اس کا حصول انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیوں کر ممکن ہے؟ ان سوالات کے جوابات پانے کے لیے متعدد پہلوؤں سے غور کرنا ضروری ہے۔

اولاً: قرآن حکیم کے مطابق انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس منصب پر فائز مخلوق سے فساد فی الارض اور خوں ریزی کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ سورہ البقرہ (آیات ۳۰ تا ۳۹) میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنی ذہنی اور علمی قابلیتوں کا صحیح استعمال کرے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے تو فساد فی الارض اور خوں ریزی کے تمام راستے مسدود ہوسکتے ہیں۔ امن وامان کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ فساد فی الارض کا وجود ہی ہے، بلکہ فساد عین بدامنی اور بدامنی ہی فساد ہے۔ مزید برآں فساد کی قباحت و شناعت میں مذکورہ پچاس آیات میں سے نو آیتیں براہ راست فساد کی سخت مذمت میں نازل ہوئی ہیں (مثلاً الاعراف ۵۶، ہود ۸۵ وغیرہ) ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فساد کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے (ھود-۱۱۶) رسولوں نے بہ طور مشن فساد کے خلاف آواز اٹھائی ہے (الاعراف-۸۵)۔ قرآن حکیم کی رُو سے فساد فی الارض کے جرم کا مرتکب سخت ترین تعزیری سزا کا مستحق ہے اور اسلامی نظامِ حکومت جو قرآنی احکام کے نفاذ کی مجاز ہے، جرم کی شناعت و قباحت کے بقدر سخت سے سخت تعزیری سزا دے سکتی ہے (المائدہ-۳۳) تاکہ کسی شخص کو نقض امن کی جرأت نہ ہو۔

ثانیاً: اس دنیا میں ارتکابِ ظلم ہی فساد فی الارض اور بدامنی کی سب سے بڑی وجہ رہی ہے اور انفرادی و اجتماعی ظلم و فساد کی جڑ قرآن پاک کے نزدیک الشرک باللہ ہے۔ لہٰذا حقیقی امن وامان کا قیام توحید کو مانے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں بالکل واضح الفاظ میں ارشاد باری ہے:

الَّـذِیْـنَ آمَـنُوا وَلَمْ یَلْبِسُوا إِیْمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَــئِکَ لَهُـمُ الأَمْـنُ وَهُـم مُّهْتَدُون (الانعام-۸۲)	جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

تاریخ اسلامی گواہ ہے کہ توحید کے سب سے بڑے علم برداروں یعنی رسولوں

کے ہاتھوں ہی دنیا میں امن وسلامتی کا حیات بخش پیغام عام ہوا اور اسی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ کے پیغامِ توحید کی برکت سے وہ امن وامان برپا ہوا کہ آیت کی پیشین گوئی کے مطابق ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرتا تھا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہیں ہوتا تھا۔ ۸ ؎

ثالثاً: قرآن کی رُو سے انسان اس دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجا گیا ہے (الملک-۲) اس امتحان کا نتیجہ مرنے کے بعد جنت یا جہنم کی شکل میں برآمد ہوگا۔ اخروی زندگی دائمی ہوگی اور اُس زندگی میں کامیابی یا ناکامی اِس دنیوی زندگی کے اعمال پر منحصر ہے۔ وہاں یا تو دارالسلام (جنت) میں ابدی پناہ گاہ کی سہولت ہوگی یا دارالعذاب (جہنم) میں رسوا کن اور ابدی قیام کی مصیبت۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (ص-۲۷،۲۸)

ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور اِس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں، یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟۔

اس آیت میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مقابل میں فساد فی الارض کو لایا گیا ہے، جس سے خود بہ خود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ بدامنی پھیلانے والوں کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ آخرت کا عقیدہ ہر لحہ اس پر محتسب بن کر نہ صرف فساد سے روکتا ہے، بلکہ تمام حقوق کی بہترین ادائیگی کے ذریعہ ان کے اور دنیا کے لیے باعثِ امن وسکون بنتا ہے۔

رابعاً: پائدار امن وسکون اللہ کے رسولوں کے بتائے ہوئے طریقوں میں ہے، جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے کہ جو رسولوں کے بتائے ہوئے راستہ سے انحراف کرے تو یہی

لوگ فساد کی راہ پر گامزن ہیں اور ان کے لیے دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں رسوا کن عذاب ہے‘‘ (الاعراف-۸۵،۱۰۳-النمل-۱۴)

خامساً: انسانی زندگی میں امن وسکون کے معیارات مقرر کرنے کا حق اور فلاح و خسران کے پیمانے وضع کرنے کی ذمہ داری خالق کائنات ہی تک محدود رہنی چاہیے: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۔النحل-۹ (اللہ ہی کے ذمہ راستہ کی رہنمائی ہے، جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں)۔ یہ حق انسان کو ہرگز نہیں ملنا چاہیے کہ وہ حقیقی امن وسکون کے قیام وحصول کے پیمانے مرتب کرے۔ کیوں کہ مبادا اس کا یہ فعل ’فساد‘ کی نازک حد میں داخل کردے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ (الرعد:۴۱)

خشکی اور تری میں انسانوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بدولت فساد رونما ہو گیا ہے۔

قرآن میں لفظ ’امن‘ کے استعمالات

قرآنی اصطلاح میں ’امن‘ ایک تقابلی صفت ہے اور اکثر وبیشتر خوف ہی کے مقابلہ میں استعمال کی گئی ہے، جس کا مطلب ہے ’پناہ اور امان دینا‘ اور خطرات سے مامون ومحفوظ ہوجانا۔ قرآن مجید میں اڑتالیس مقامات پر اس کے مختلف مشتقات اس کے تقابلی صفت ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً اٰمِنِین ، اَمَنَةً، اٰمِنون، اٰمِناً، اَمَنَ، اَمْنا وغیرہ۔ جب کہ سکون ومساکن کل ۴۸ مقامات پر، اطمینان اور اس کے مشتقات ۱۲ مقامات پر اور سکون بمعنی سکینہ اور تسکین ۱۳ مقامات پر Absolute صفت کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں، جب کہ خوف کے مشتقات قرآن حکیم میں ایک سو سترہ مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔[۹]

عصری اور اسلامی تصوراتِ امن کا تقابل

دور جدید کے لٹریچر میں امن کی اصطلاح ’جنگ‘ کے مقابلہ میں زیادہ استعمال ہوتی ہے اور جنگ کو ’عدم امن‘ ہی نہیں بلکہ ’مغائرِ امن‘ سمجھا جاتا ہے، یعنی جنگ کے ذریعہ پائیدار امن کا حصول دانش وروں کے نزدیک گویا ایک نامعقول خیال ہے، جب

کہ عملی دنیا میں آج کل اس کی دوسری انتہا کو بین الاقوامی ادارۂ امن یعنی UNO تک کا Mandate حاصل ہے، چنانچہ آج کی یک قطبی دنیا کے لیڈروں کا گویا نعرہ ہے 'امن کا قیام بذریعہ جنگ'۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان قرآن کا تصور امن بڑا متوازن ہے جو جنگ کو شجرِ ممنوعہ نہیں گردانتا اور حقیقی امن وامان کے قیام کی خاطر اس کی اجازت دیتا ہے (الحج-٣٨)۔ البتہ حتی الامکان جنگ سے گریز اور صلح کی راہ کو پسند کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ انفال (آیت ٦١) اور سورہ النساء (آیت ٩٠) میں بالکل واضح طور پر حکم دیا گیا ہے کہ اگر دشمن نہ لڑے اور صلح کا پیغام دے تو اللہ نے ان کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

اگر ان دونوں تصوراتِ امن کا تقابلی مطالعہ کریں تو عصری تصور، دشمن کی غیر موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جب کہ قرآن کا تصورِ امن عدم خوف کی حالت اور تحفظ جان و مال وعزت وآبرو کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے تعلق سے امن کے یہ معنٰی ہیں کہ تمام لوگ بلاخوف وخطر اور اللہ کی امان میں سفرِ حیات طے کریں اور 'حالت امن' کی نسبت سے اس کے معنٰی ہوں گے 'پرسکون اور مصائب وفساد سے محفوظ زندگی'، جب کہ دشمن کا نہ ہونا ایک Idealistic اور غیر حقیقی (unrealistic) خیالِ موہوم (utopia) ہے۔

سورہ الانعام کی مذکورہ بالا آیت ٨٢ کا ایک اور انداز سے تجزیہ کرنے سے حقیقی امن وسکون کی کئی اور جہات سامنے آتی ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ 'جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں'۔ بلاشبہ شرک تمام مظالم کی جڑ اور ظلم عظیم ہے اور ایمان کو شرک سے آلودہ کرنے والے کبھی حقیقی امن وسکون حاصل نہیں کرسکتے، کیوں کہ وہ انفرادی سطح پر انتشار ذہنی کا شکار ہوکر رہتے ہیں۔ وہ ایک خدا کے لیے یکسو نہیں ہیں اور کئی خداؤں کو بیک وقت خوش کرنا چاہتے ہیں، جن کی اپنی اپنی امتیازی صفات پر ان کا یقین ہے تو پھر وہ کسی بھی خدا کو اور ساتھ ہی خود کو بھی خوش نہیں رکھ سکتے۔ اس آیت کا ایک سیدھا سادہ مفہوم یہ بھی ہے کہ جو لوگ ایمان لاکر ظلم وتعدّی سے اجتناب کرتے رہے ان کے لیے حقیقی امن ہے۔ بالفاظ دیگر جس شخص کے دل ودماغ میں ایمان، امانت اور حسن امان

رچ بَس جائے اور جو ظلم کی ہر قسم سے کلّی متنفر ہو ایسے افراد پر مشتمل سوسائٹی کو قرآن مجید حقیقی امن وسلامتی کی ضمانت دیتا ہے۔

امن کا جامع تصور

عصرِ حاضر میں تصورِ امن کی جامع تصویر انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی معلوم ہوتی ہے اور اس کا عمل دخل ہر وقت اور ہر مقام پر محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً انفرادی سطح پر امن، ذہنی سکون (Peace of mind) ، اطمینان قلب، عدم خوف، عدم تکلیف جیسی تمام مثبت کیفیات سے عبارت ہے، جب کہ اجتماعی سطح پر عدم جنگ، عدم ظلم، عدم فساد، سلامتی اور عدل وانصاف، باہمی محبت ومودّت، حسنِ اخلاق، اظہار مساوات وغیرہ جیسی کیفیات کو امن وامان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں سطحوں پر 'امن وسلامتی' کو نفسیاتی ، معاشرتی، ازدواجی، معاشی، قانونی، اخلاقی، علمی وفکری اور نظریاتی پرتوں (Levels) پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اجتماعی طور پر احترام جان و مال، احترام عزت و آبرو اور آزادیٔ رائے وضمیر وعقیدہ وغیرہ کے بغیر قیامِ امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ جہالت، عدم مساوات، جرائم، ظلم، فساد، ذہنی انتشار وغیرہ قیامِ امن کی راہ کی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ حسنِ اخلاق، عفو و درگزر، امانت و دیانت، ایثار وقربانی، مثبت اور پاکیزہ سوچ (Optimism) عدل وانصاف جیسے اچھے اوصاف کا مظاہرہ حصولِ امن و سکون میں ممدّ ومعاون بھی ہیں اور قیام امن کو مہمیز بخش کر پائداری بھی فراہم کرتے ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ محض وقتی قیامِ امن ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ضرورت ہے پائدار اور حقیقی امن کے حصول کی۔ کیوں کہ انفرادی طور پر وقتی سکون تو منشیات و مسکات (Drugs & Trinquilizers) سے بھی حاصل ہوسکتا ہے اور جزوی طور پر اجتماعی امن وسکون جنگ کی غیر حاضری یعنی عدم جنگ کو بھی کہا جاسکتا ہے، مگر کون نہیں جانتا کہ یہ تمام ذرائع اور مظاہرِ سکون انفرادی یا اجتماعی طور پر نہ صرف علامتی اور ظاہری شکلیں ہیں بلکہ ناپائدار اور بعض اوقات امن وسلامتی کے لیے نقصان دہ بھی ہیں۔

اسلام اور ایمان کی اصطلاحات پر ایک نظر

اب اصل سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اُس پائیدار حصولِ سکون اور قیام امن وسلامتی کی بہترین شکل کیا ہے؟ قرآن حکیم تمام انسانی مسائل کا حل یہی بتاتا ہے کہ اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ كَافَّةً (البقرہ-۲۰۸) یعنی 'سِلْم' میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ 'سِلْم' سلامتی سے ہے، یعنی اس دینِ سلامتی (اسلام) کے حقائق پر ایمان لا کر اپنی پوری زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگ لو (البقرہ- ۱۳۸) چوں کہ اللہ تعالیٰ سراسر 'السّلام' یعنی سلامتی ہی سلامتی ہے (الحشر-۲۳)۔ قرآن حکیم کی دونوں بنیادی اصطلاحیں یعنی 'ایمان واسلام' امن وسلامتی ہی کے مشتقات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نظام زندگی کے لیے 'اسلام' کی اصطلاح تجویز کیا جانا بھی اس کی عظیم حکمتوں میں سے ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ' (آل عمران-۱۹) یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک (پسندیدہ) دین تو اسلام ہی ہے۔ اسی طرح اس دین کو ماننے والا 'مؤمن' کہلاتا ہے اور مؤمن کے لغوی معنٰی 'امان دینے والا' ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام بھی 'المؤمن' ہے۔ مولانا مودودی اپنی تفسیر میں اس لفظ کے ذیل میں رقم طراز ہیں: ''اصل میں لفظ المؤمنُ استعمال ہوا ہے جس کا مادہ 'امن' ہے۔ اس کے معنٰی ہیں خوف سے محفوظ ہونا اور مومن وہ ہے جو دوسرے کو امن دے۔ اللہ تعالیٰ کو اس معنٰی میں مؤمن کہا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے۔ اس کی خلق اس خوف سے بالکل محفوظ ہے کہ وہ کبھی اس پر ظلم کرے گا، یا اس کا حق مارے گا، یا اس کا اجر ضائع کرے گا، یا اس کے ساتھ اپنے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ پھر چوں کہ اس فاعل کا کوئی مفعول بیان نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کس کو امن دینے والا ہے، بلکہ مطلقاً المؤمن کہا گیا ہے، اس لیے اس سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ اس کا امن ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کے لیے ہے۔[۱۰]

قرآن مجید کے نزول کا بنیادی مقصد اسلام کی دعوت اور اس پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایمان کے مختلف مشتقات چار سو اٹھارہ جگہ آئے ہیں، جن کی روشنی

میں انسانی زندگی کا پورا نظامِ امن وایمان واضح ہوتا اور تشکیل پاتا ہے۔مزید برآں مذکورہ بالا آیتِ امن وایمان میں ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پروانۂ 'امن' کا ملنا بذات خود المومن الکریم کی طرف سے 'نفس امن اور قدر امن' کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی سے عبارت ہے۔(الانعام-۸۲)

اسی طرح قرآن حکیم کی اصطلاحِ 'اسلام' اس کے 'دینِ سلیم' ہونے پر دال ہے اور 'سلامتی' کی انسانی زندگی میں اہمیت واشگاف کرتی ہے۔قرآن مجید میں اسلام کے مختلف مشتقات بشمول لفظ اسلام بیاسی مقامات پر استعمال ہوئے ہیں[۱۱] جو اس دین سلامتی کو مختلف زاویوں سے غور کرنے اور دنیوی زندگی میں حصول سلامتی کی دعوت دیتے ہیں۔ مزید برآں دینِ اسلام میں بہترین تہذیبی شعار 'السلام علیکم' سلامتی کی دعا ہے اور مسلمانوں کے تشخص کی علامت بھی (النساء-۹۴)۔ یہ کلمۂ دعا مومنین ومتقین کے لیے خاص طور سے 'دارالسلام' یعنی جنت میں اور ان کی جاں کنی کے وقت، بلکہ دنیوی زندگی کے ہر اہم موقع پر اللہ رب العزت کی طرف سے، فرشتوں کی طرف سے اور ان کے جنّتی ساتھیوں کی طرف سے پیش کی جاتی رہتی ہے یا پیش کی جاتی رہے گی (الاعراف ۴۶- یونس ۱۰- یٰس ۵۸- واقعہ ۲۶، ۹۱ وغیرہ)۔قرآن مجید میں چالیس مقامات پر 'اسلام' کو ایک مہتم بالشان نعمت اور عظیم شعیرہ کی شکل میں مومنین وصالحین کی علوّ شان کی علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے[۱۲]۔ کسی کو سلام کرنا محض ادائیگی رسم ہی نہیں، بلکہ مخاطب کے ہاتھوں مامون ومحفوظ ہوجانے کا پروانہ حاصل کرنا ہے (النساء-۹۴)۔ دائمی اور حقیقی سلامتی کا تصور قرآن کے نزدیک ایک آئیڈیل زندگی کا تصور ہے۔اس کے مطابق ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ابدی ولازوال سلامتی تو صرف جنت ہی میں حاصل ہوسکتی ہے۔اس کی خواہش مومنانہ خواہش اور اس کے لیے سعی وسبقت کرنا مطلوب ہے (آل عمران-۱۳۳، الحدید-۲۱، المطففین-۲۶)۔ جنت 'دارالسلام' یعنی سلامتی کا گھر ہے (الانعام-۱۲۷، یونس-۲۵) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام 'السلام' ہے (الحشر-۲۳)۔

امن وسکون کا مظاہرہ خاندانی اور معاشرتی زندگی میں

اسلام معاشرہ میں امن وسکون کو کتنی اہمیت دیتا ہے اسے ایک مثال سے بہ خوبی سمجھا جاسکتا ہے ۔ اسلام انسان کے انفرادی سکون و آرام کو اس کا بنیادی حق تسلیم کرتا ہے۔ اگر کبھی معاشرتی حدود وقوانین اور انفرادی سکون میں باہم ٹکراؤ ہوتو وہ انفرادی چین و سکون کو ترجیح دینے کی سفارش کرتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ معاشرہ کی اکائی خاندان ہے اور خاندان کی بنیاد اسلام کی رو سے مرد وزن کے درمیان رشتۂ نکاح سے پڑتی ہے اور عقدۂ نکاح قرآن حکیم کے مطابق معاشرہ کے رو برو آپسی عہد و وفا اور زن وشو کے درمیان مودّت وسکون کا بندھن ہے۔مگر جب زوجین کے ’چین وسکون‘ کی راہیں کوشش کے باوجود بالکل مسدد ہوجاتی ہیں تو وہ اس عقدِ نکاح کی گرہ کھول کر آزاد بھی ہوسکتے ہیں۔اسلام کے عائلی قوانین ’خلع وطلاق‘ کی اجازت خاندانی عزت و ناموس اور اقدار پر انسان کے بنیادی حقِّ سکون کی ترجیح سے عبارت ہے۔ چنانچہ ہزاروں سال سے مہذب دنیا نکاح کے بعد علیٰحدگی کو قبیح و کریہہ گردانتی ہے اور اسلام بھی اس سے مستثنٰی نہیں ہے،مگر اس کے باوجود اگر زوجین میں سے کوئی بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس ازدواجی زندگی کی قید میں رہ کر اس کا چین وسکون غارت ہورہا ہےتو وہ محض حصول سکون کی خاطر اور اس حالتِ عدم سکون سے نکلنے کے لیے اس عہدِ وفا سے نکل سکتا اور اس معاشرتی و قانونی قید سے آزاد ہوسکتا ہے۔اسلام اور دیگر مذاہب میں یہ بنیادی فرق اتنا واضح ہے کہ اسلام میں فریقین کی تفریق کے لیے مدّعی کو بے وفائی کی کوئی جھوٹی کہانی گھڑنے کی بالکل ضرورت نہیں، جب کہ دوسرے مذاہب میں وفا کا بندھن ٹوٹنا ہی تفریقِ زوج کی اجازت فراہم کرتا ہے ۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے ہاں نہ تو انفرادی چین و سکون کو بنیادی مقام ملا ہے اور نہ انفرادی آزادی کی کوئی اہمیت ہے جس کو حاصل کرنے کی بخوشی اجازت دی گئی ہو۔اور اگر بحالت مجبوری آزادی دی بھی جاتی ہے تو فریق اول یعنی مدعی فریق ثانی کی کردارکشی کرکے اور معاشرہ کے کچھ افراد کے سامنے لازمی طور پر ظلم پر مزید ظلم قبیح کا مرتکب ہوتا ہے، نیز اپنے ضمیر کو کچل کر اور فریق ثانی کی عزت و ناموس پر

ڈاکہ ڈال کر نہ صرف اپنا اور اپنے ماضی کے شریک حیات کا، بلکہ کم از کم دو خاندانوں کے چین وسکون کو درہم برہم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ان تمام گناہوں اور بے آرامیوں کا اصل ذمہ دار وہ نظریہ اور قانون ہے جو انسان کو وہ بنیادی حقِ سکون نہیں دیتا جس کا وہ بہ حیثیت انسان مستحق ہے۔

اسلام سکون سے آگے بڑھ کر آلات ومحرکات اور ذرائعِ سکون مثلاً زینت، لطف اندوزی اور آرام وغیرہ تک کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ...(الاعراف-۳۲)

اے نبی آپ کہہ دیجیے کہ کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کردیا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کردیں؟ آپؐ کہیے، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصۃً انہی کے لیے ہوں گی۔

قرآن حکیم کے مطابق زن وشوہر کا بندھن دراصل سکون حاصل کرنے اور آپسی محبت ومودت کا رشتہ استوار کرنے کے لیے ہے (الروم-۲۱) اللہ کے رسول ﷺ نے حقوق اللہ کی ایسی پاس داری وانہماک سے منع فرمایا جس میں انسان کے انفرادی سکون تو کجا آرام ولذت کوشی تک پر بے جا ضرب پڑتی ہو۔ چنانچہ آپؐ نے واضح ترین الفاظ میں ارشاد فرمایا:

ولجسدک علیک حقا ولزوجک علیک حقا[۱۳]

تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیری زوجہ کا تجھ پر حق ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام نے انفرادی سکون کو اتنی اہمیت دی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انفرادی سکون وراحت درحقیقت اجتماعی ومعاشرتی امن وسکون کا ضامن ہے، نیز افراد کا اجتماعی سکون ہی معاشرہ میں امن وامان سے عبارت ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ

نہیں کہ عصرِ حاضر میں امن وسکون کو غارت کرنے والا سب سے بڑا عامل معاشرہ میں موجود افراد کا ذہنی انتشار اور زندگیوں میں اطمینان قلب کا فقدان ہے۔ دنیا کے اسّی فیصد مسائلِ امن انفرادی عدمِ سکون ہی کے شاخسانے ہیں۔ اسی لیے اسلام ان تمام منفی عوامل ومحرکات کا قلع قمع کرنے کے لیے اوصاف رذیلہ سے اجتناب کا حکم دیتا ہے اور ایسی فضا قائم کرتا ہے جس میں ہر شخص سکون وراحت کی زندگی سے متمتع ہو سکے۔

آج کے ملحدانہ ماحول میں عائلی زندگی میں چین وسکون عنقا ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زن وشو ایک دوسرے سے شاکی ہیں اور اپنے حقوق کے سلسلہ میں عدمِ اطمینان کا شکار ہیں۔ اکثر ان کے شک کی سوئی بدگمانی سے آگے بڑھ کر قطعی بے وفائی تک جا پہنچتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں عدم اعتماد اور باہمی وفاداریوں کو قدامت پسندی کا طعنہ دینے کا رجحان خاندانی چین وسکون کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ اسلام انسان کو اُن تمام رذائل سے روکتا ہے جو اس کی نجی اور عائلی زندگی کے چین وسکون پر شب خون مارتے ہیں۔ چنانچہ غضّ بصر کا حکم (النور:۱۰-۳۱)، پردہ کا حکم (الاحزاب:۵۹- النور:۳۰،۳۱)۔ دوسروں کے گھروں میں بلا روک ٹوک آنے جانے پر قدغن لگانے کا حکم (النور: ۲۷-۲۸ اور ۵۸-۶۰)، حرمتوں کی پاس داری قائم رکھنے کا حکم (النور:۳۲-۳۳، المائدہ:۱-۲) وغیرہ اور ان تمام اخلاقی اقدار سے آگے بڑھ کر زنا اور تہمتِ زنا کے لیے سخت ترین اور عبرت ناک تعزیری سزاؤں کا حکم (النور:۲ تا ۴) اسی سمت میں بہترین اور موثر اقدامات ہیں۔

عام اسلامی معاشرہ میں امن وسکون کا ماحول قائم کرنے کے لیے جہاں ایک طرف خارجی دشمنوں سے نپٹنے کے بہترین انتظامات کیے گئے تو دوسری طرف داخلی سطح پر تمام اخلاق رذیلہ اور افعال شنیعہ سے نفرت پیدا کی گئی، مثلاً: تمسخر، عیب چینی، تنابز بالالقاب، بدگمانی، جستجوئے بے جا اور غیبت (الحجرات- ۱۲۷) ایمرجنسی کی حالت میں افواہوں کا پھیلنا اور پھیلانا (النساء-۸۳) اور بلا تحقیق اہم خبروں کی تصدیق اور غیر ثقہ افراد کی خبروں پر اہم اجتماعی فیصلے وغیرہ (الحجرات-۶) مزید برآں بغض وحسد اور تحقیر

وتذلیل کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی (الفلق ۵-الحجرات ۱۱)۔

آج کی دنیا میں امن وسکون ناپید ہے، کیوں کہ انسانوں کا آپسی رشتہ رحم و مساوات، مروّت اور حسن ظن کے بجائے قطع رحمی، عدم مساوات، نفرت، تحقیر اور بدظنی پر قائم ہے اور اس کا دائرہ کار زن وشو، بھائی بہن اور رشتہ داروں سے لے کر جماعتوں، ملکوں اور حکومتوں تک محیط ہے، جب کہ اسلام تمام انسانوں کو اللہ کا کنبہ[۱۴] اور آدم وحوا کی اولاد (الحجرات-۱۳) قرار دیتا ہے نیز اللہ اور رحم کا واسطہ دے کر انسانی رشتوں کو استوار کرتا ہے، جس کی بنا پر عدم مساوات، قطع رحمی، نفرت اور دیگر اخلاقِ رذیلہ کے ارتکاب کی گنجائش ہی نہیں نکلتی (النساء-۱)۔

اسلام اور اہلِ اسلام پر دہشت گردی کا الزام

آج کی بد امنی کے پیچھے خود حکومتِ وقت کی غیر انسانی اور نابرابری کی پالیسیاں بھی کم نہیں، بدعنوانی اور ظلم وتشدد کا بول بالا بھی انسانی سکون کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔عوام قانون وانصاف کی مشنریوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ان کی اکثریت ظلم سہنے اور انصاف نہ ملنے کی وجہ سے عدم سکون کا شکار ہے تو بعض سر پھرے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر معاشرتی سکون کو غارت کر رہے ہیں۔ایک طرف نام نہاد، موہوم اور حقیقی دہشت گرد تنظیموں سے دنیائے انسانیت پریشان ہے تو دوسری طرف طاقت ور حکومتیں اپنی طاقت کے نشہ میں امن وانصاف کے نام پر دوسرے کم زور ملکوں پر حملہ کر کے بدامنی پھیلانے کی بدترین مجرم بن گئی ہیں۔ یہ فسادی افراد اور حکومتیں اسی دنیا میں اپنی جنت بنانے کے خیال سے دنیا کے امن وامان اور افراد کے چین وسکون پر لگاتار ڈاکے ڈال رہے ہیں اور ساتھ ہی امن وانصاف کی دہائی بھی دیتے جاتے ہیں۔اسلام ان تمام افراد اور حکومتوں نیز ان کے سارے اعمال وافکار کو سراسر غیر اسلامی قرار دیتا اور ان کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔لیکن بدقسمتی سے اسلام کی پاکیزہ اصطلاح 'جہاد' کو بدنام کرنے کے لیے اسلامی دہشت گردی نام کی نئی اور مذموم اصطلاح وضع کی گئی ہے اور

دہشت گردی جیسے قطعی غیر اسلامی اور بہیمانہ فعل کو قرآن کریم کے نام لیواؤں کے سر تھوپ دیا گیا ہے، جب کہ سچ یہ ہے کہ سب سے زیادہ طعن و تشنیع کی ہدف 'جہاد بالسیف' کی اصطلاح بھی متفقہ طور پر فتنہ وفساد کو روکنے کی آخری، اجتماعی منظّم اور موثر ترین کوشش اور پائیدار امن وامان کے حصول و قیام کا ضامن ایک عملی قدم ہے۔ جہاد بالسیف کسی انفرادی حربی کارروائی کا نام ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے اسلام میں متعدد شرائط عائد کی گئی ہیں، تاکہ ظلم وفساد نیز خودکشی اور فتنہ کو اس پاکیزہ عمل سے خلط ملط نہ کیا جاسکے۔

دہشت گردی بنام اسلام کے تعلق سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ دورِ حاضر کی دہشت گردی کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ دشمنانِ اسلام ہی کی پیدا کردہ، انھی کے ذریعہ تقویت فراہم کی جانے والی (Sponsored) اور انھی کے آلہ کاروں کے ہاتھوں انجام دیے جانے والے افعال ہیں جو ایک سازش کے تحت اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور ان میں دہشت پھیلانے کے لیے باقاعدہ اور منظّم طور پر کیے جارہے ہیں۔ مزید برآں عالمی سپر پاورز کی ریاستی دہشت گردی اور اسرائیل کی کھلّم کھلاّ دہشت گردی سے کون انکار کرسکتا ہے؟ افغانستان، عراق اور فلسطین کی دہشت گردانہ کارروائیوں کا شکار کون ہے؟

قرآن کی ایک جامع آیت

قرآن کے تصورِ امن کے حوالہ سے سورۂ المائدہ کی آیت ۳۲ بڑی اہم ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مِنۡ أَجۡلِ ذٰلِکَ کَتَبۡنَا عَلٰی بَنِیۡ إِسۡرَائِیۡلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفۡساً بِغَیۡرِ نَفۡسٍ أَوۡ فَسَادٍ فِیۡ الأَرۡضِ فَکَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعاً وَمَنۡ أَحۡیَاهَا فَکَأَنَّمَا أَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعاً

(سورہ المائدہ:۳۲)

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کردیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

یہ آیتِ قرآنی تصورِ امن کی کئی جہات پیش کرتی ہے۔ اوّلاً یہ کہ ’قتل نفس‘ اسلام کی نظر میں اتنا معیوب ہے کہ اس کو تمام دنیا کے انسانوں کے قتل کے برابر سمجھا گیا ہے۔ ثانیاً فساد فی الارض اسلام کی نظر میں قتلِ نفس سے بھی زیادہ معیوب ہے، لہٰذا فساد فی الارض کا مرتکب واجب القتل ہے۔ ثالثاً کسی انسان کی جان بچانا گویا دنیائے انسانیت کی جان بچانا ہے۔ رابعاً اسلام قتلِ نفس کے قصاص کے ذریعہ عدل وقسط کے معاملہ میں کوئی مداہنت برداشت نہیں کرتا۔ خامساً اس آیت میں احترام جان کا انتہائی اعلیٰ معیار پیش کیا گیا ہے، یعنی ایک انسان کی ناحق موت دنیائے انسانیت کی موت اور نفس انسانی کی زندگی بنی نوع انسانی کی مجموعی زندگی کے مترادف و یکساں قرار دی گئی ہے۔ سادساً اس آیت میں ’وَمَنْ اَحْیَاھَا‘ کہہ کر اتنی بڑی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے جو ناقابل تصور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ روزِ اول سے آج تک کوئی شخص مارنے کا دعویٰ تو کرسکتا ہے، مگر وہ انسان کو ’جلانے یا زندہ کرنے‘ کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ معنوی طور پر ’جلانا اور حیات بخشنا‘ نہ صرف سکون وچین اور امن وامان کو مستلزم ہے، بلکہ اس کو تمام ترمسرتوں سے ہم کنار کرنے سے عبارت ہے۔ انسانی اقوام اس دنیا میں معنوی طور پر سیاسی موت، معاشی موت، علمی وفکری موت، سماجی موت اور تہذیبی موت وغیرہ سے دوچار ہوتی رہتی ہیں۔ کتنے امن و آشتی کے علم بردار ان معنوں میں انسانیت کے احیاء کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

اس تفصیلی بحث سے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے امن وامان اور سکون وسلامتی کو جو مقام دیتا ہے وہ کسی بھی فلسفۂ حیات میں موجود نہیں ہے۔ قرآن کا تصورِ امن ہمہ گیر، ہمہ جہت اور پائدار امن وسلامتی کی ضمانت دیتا ہے، جب کہ دنیا کے سارے انسانی فلسفے یا انسانی دست بُرد سے مملوالٰہی فلسفے محض ظاہری اور عارضی حالتِ امن کے علم بردار ہیں اور اسی کو منزل سمجھ بیٹھے ہیں۔

حواشی ومراجع

۱- تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء، ۱/ ۴۷٦

۲- ملاحظہ کیجیے البقرۃ: ۱۲۵، ۱۲٦، آل عمران: ۹۷، المائدۃ: ٦۷،۹۷، ابراہیم: ۳۵، القصص: ۵۷، العنکبوت: ٦۷، الفتح: ۲۷

۳- ملاحظہ کیجیے المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، محمد فؤاد عبدلباقی، مادہ 'فساد'

۴- رحمۃ للعالمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوری

۵- اللہ کے رسول ﷺ کی اس پیشین گوئی کے لیے ملاحظہ کیجیے صحیح بخاری کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام

٦- تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، سورۂ التوبہ، حاشیہ نمبر ۳۲

۷- تدبر قرآن، ۳/ ۵٦۴، ۸/ ۳٦۴

۸- صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، وکتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی ﷺ واصحابہ من المشرکین بمکۃ

۹- ملاحظہ کیجیے المعجم المفہرس، مادہ: امن، سکن، خوف

۱۰- تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۃ الحشر، حاشیہ نمبر ۳۹

۱۱- ملاحظہ کیجیے المعجم المفہرس، مادہ سلم

۱۲- حوالہ سابق

۱۳- صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم اور دیگر ابواب صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النھی عن صوم الدھر...الخ

۱۴- رواہ البیہقی فی شعب الایمان والبزار فی مسندہ، فیض القدیر، مناوی، ۳/ ۵۰۷ (یہ روایت ضعیف ہے)